© rasailojaraid.com



# نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

## (حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں)

—— نعیم صدیقی ——

## (۶)

[اس مبحث کا تسلسل بیچ میں ٹوٹ گیا تھا، اب ایک لمبے وقفے کے بعد پھر یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اللہ ہی سے دعا ہے کہ اسے تکمیل تک پہنچانے کی توفیق دے۔]

**رسولؐ — ایک مستقل اتھارٹی اور سند** اب تک کی گفتگو سے اس مغالطہ کے جھاڑ جھنکار کو ہم نے اپنی فکر کے راستہ سے صاف کر لیا ہے کہ خدا کا رسولؐ (نعوذ باللہ) محض ایک قاصد تھا، اس نے نامۂ دلبر ہمیں پہنچا دیا، اب اُس سے ہم کو کوئی واسطہ نہیں، ہم جانیں اور ہمارا خدا اور ہمارے خدا کا دین جانے، اپنے خدا سے جیسا معاملہ ہمیں رکھنا ہوگا ہم خود اسے سوچتے رہیں گے اور جو مفہوم اس کے دین کا ہمیں متعین کرنا ہوگا از خود کرتے رہیں گے۔ ہماری اب تک کی بحث اس حقیقت کو ضلالت کے گرد و غبار سے پونچھ پانچھ کر سامنے لے آتی ہے کہ رسولؐ کا فریضہ منکرین کی حد تک تو بات کو پہنچا دینے پر ختم ہو جاتا ہے، لیکن مومنین کے بارے میں اس کے وسیع اور گوناگوں فرائض کا دائرہ بڑا وسیع دائرہ ہے۔ وہ ان کے لیے معلّم بھی ہے، مربّی بھی ہے، مزکّی بھی ہے، امیرِ جماعت بھی ہے، تحریکی رہنما بھی ہے، حاکم و سلطان بھی ہے، چیف جسٹس بھی ہے، سپہ سالار بھی ہے، امامِ صلوٰۃ بھی ہے اور خطیبِ جامعہ بھی ہے، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اُن کا کارپرداز ہے۔ پھر چونکہ اس کی یہ ساری حیثیتیں ایسی ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عائد کی گئی ہیں اور ان سب میں وہ اسی کی طرف سے نامزد اور مامور ہے، اس لیے وہ ان ساری حیثیتوں کے لحاظ سے سند اور معیارِ فیصلہ اور نمونہ اور اتھارٹی بھی ہے!

**سراجاً منیراً** اس حقیقت کے لیے قرآن میں نبی صلعم کے لیے ایک بہترین تمثیل موجود ہے۔ آپ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بطورِ استعارہ "سراجاً منیراً (سورۂ احزاب - ۵) قرار دیا گیا ہے - اس تمثیل سے خود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک چراغ داں اور شمع بردار نہیں تھے بلکہ بجائے خود ایک قندیل روشن تھے - یہ قندیلِ نبوت جس کا فتیلہ ایمان وحی کے روغن سے چرب ہو کر عشقِ الٰہی کے شعلہ سے روشن تھا، بجائے خود ہدایت کے نور کا ایک سرچشمہ تھی اور آنکھیں اس سے اکتسابِ ضیاء کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے دین کے راستے کو پا نہیں سکتیں - یہ بات ٹھیک اس مقام پر کہی گئی ہے جہاں اور عرب کی ایک دیرینہ روایت — یعنی متبنّیٰ کو ہر لحاظ سے حقیقی بیٹوں کا مرتبہ دینے — کی پابندیوں سے بالاتر ہو کر ہدایت الٰہی کے مطابق چلنے کی تلقین آنحضورؐ کو فرمائی گئی ہے، اور اسی سلسلے میں آنحضورؐ کے منصبِ ختمِ نبوت کا ذکر یہ اشارہ دینے کے لیے کیا گیا ہے کہ اگر آپؐ بھی اس روایت کو توڑ کر نہ رخصت ہو گئے تو پھر کوئی اور نبی تو آنے والا ہے نہیں کہ وہ معاشرے کو اس بندھن سے نجات دلائیگا۔ یہ کام آپؐ ہی کے ہاتھوں ہو جانا ضروری ہے - اسی بات میں سے بات نکلتی ہے اور یہاں آ جاتی ہے کہ آپؐ انسانیت کے لیے، خصوصاً مسلم معاشرے کے لیے ایک شمعِ راہ ہیں، آپ کی عملی زندگی کی روشنی میں جو راہیں دنیا پر کھل جائیں گی، آئندہ قافلے کے قافلے ان پر گامزن ہونے والے ہیں اور جو راہیں مسدود قرار پائیں گی، ان کی طرف رُخ کرنے کی کسی کو جسارت نہ ہو گی - چنانچہ اس کے بعد ہی یہ کہا جاتا ہے کہ ولا تطع الکفرین والمنافقین ودع اذٰھم (کفار اور منافقین کی پسند و ناپسند کا لحاظ کیے بغیر اور ان کی ایذا رسانیوں سے کوئی اثر لیے بغیر آپؐ تبدیلی کا قدم اللہ کے بھروسے پر (وتوکل علی اللہ) اٹھا دیجیے، اور اللہ تعالیٰ آپؐ کی کارسازی کے لیے کافی ہے -

اس شمعِ روشن کا تذکرہ اس تمہیدی بات سے شروع ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم (ایمان والوں) کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لانا چاہتا ہے (لیخرجکم من الظلمٰت الی النور)، اور پھر اگلی آیت اس مقصد کے حصول کے ذریعے کو سامنے لے آتی ہے کہ ہم نے تمہارے سامنے زندگی کے ہر معاملے میں ہدایت کی راہیں کھول دینے کے لیے یہ شمعِ روشن رکھ دی ہے: یہ ایک طرف تم کو بشیر بن کر راہِ راست بتائے گی اور دوسری طرف نذیر بن کر تمہیں ضلالت کے راستوں سے خبردار کرے گی -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



رسول اللہ کو محض فانوس نہیں قرار دیا گیا جس میں بجائے خود کوئی نور نہ ہو بلکہ وہ اپنے اندر کی مشعل کی شعاعوں کو ارد گرد بکھیر دے، نہ محض ایک طاق قرار دیا گیا ہے کہ جس کا کام اپنے اندر کے دیئے کی روشنی کو منعکس کر دینے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسے بجائے خود ایک منوّر چراغ اور ایک مشعلِ راہ بنا کے سامنے لایا گیا ہے۔

**اسوۂ حسنہ** بات اگر صرف استعارے میں لپیٹ کر چھوڑ دی گئی ہوتی اور تمثیل کی حد سے کلام آگے نہ بڑھا ہوتا تو فی الواقع مفسدین کے لیے موقع تھا کہ وہ رسولؐ کی حیثیت کو امت کے لیے مشتبہ بنانے میں بہت کچھ رخنہ اندازیاں کر سکیں۔ لیکن قرآن نے اپنی تمثیل کے مفہوم اور اپنے استعارے کے مدعا کو خود ہی جا بجا کھول کے رکھ دیا ہے۔ اور اس درجہ وضاحت و صراحت اختیار کی ہے کہ فتنہ گروں کے لیے میدانِ تگ و تاز باقی چھوڑا ہی نہیں۔ دیکھیے، رسولؐ اللہ کے مشعلِ راہ ہونے کے استعارے کی حقیقت جاننے کے لیے ذیل کی مشہور آیت ملاحظہ فرمائیے:۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ — تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ (کی زندگی) میں بھلا[1] نمونہ رکھ گیا ہے۔ (الاحزاب-۳)

اور بات اتنی ہی نہیں فرمائی، یہ بھی ساتھ ہی کہہ دیا کہ اس نمونہ کا دامن تھامنا ہر اس شخص کے لیے لازم ہے جو اللہ کے سامنے پیش ہونے اور یوم آخرت کی جوابدہی سے دوچار ہونے کا متوقع ہے (لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر) اور وہ جو اللہ کو بہت بہت یاد رکھنے والا ہے (یعنی سارا مدارِ نجات ہی اس بات پر ٹھہرا کہ آدمی نے خدا کو ماننے، اس کے دین پر کاربند ہونے اور اس کی کتاب کے قانون کی اطاعت کرنے میں رسولؐ اللہ کے پیش کردہ اسلوب اور نمونے سے کہاں تک استفادہ کیا)۔

رسولؐ اللہ کو اس طرح اسوۂ حسنہ قرار دینا اور پھر اس اسوہ کے اتباع کو واجب ٹھہرانا خود اس بات پر دال ہے کہ تنہا خدا کی کتاب کو لے کر کوئی شخص اس دین کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا جس میں اگر اصولی اتھارٹی اور سند قرآن ہے تو تشریحی اتھارٹی اور سند رسولؐ بھی ہے۔ فتنہ گر ذہن ان مواقع پر یہ چال چلتا ہے کہ جب آپ اس سے منوائیں کہ رسول اللہ صلعم کا اتباع بھی

[1] اس موقع پر یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ رفیع الدین علیہ الرحمۃ نے "اسوہ" کا ترجمہ لفظاً "چال" سے کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



فی نفسہٖ واجب ہے تو وہ کہتا ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلعم کی زندگی عین قرآن کا عکس تھی (کان خلقہٗ القرآن) لہٰذا اس کا اتباع کرنے کے لیے بھی قرآن ہی کو لے کر چلنا کافی ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے وہ یہ نہیں سوچتا کہ اگر قرآن ہی کے احکام کو لے کر چلنا ہم سے مطلوب تھا تو سیدھی طرح ایک ہی بات کہنے کے بجائے کہ قرآن پر چلو، آخر یہ کونسا اسلوبِ بلاغت ہے کہ پہلے کہا جائے کہ قرآن پر چلو، جب لوگ اس پر تیار ہو جائیں تو پھر فرمایا جائے کہ رسول اللہ کی چال بھی اختیار کرو، جب لوگ اُس طرف رُخ کریں تو پھر اُن کو ٹوکا جائے کہ ٹھہرو، ٹھہرو! رسول اللہ کی چال تو وہی ہے جو قرآن میں وضاحت سے پیش کردی گئی ہے، لہٰذا تمہارے لیے صرف قرآن کافی ہے۔ ایسے بے تکے طرزِ کلام اور ایسے بے ڈھنگے طریقِ ہدایت کی کسی ادنیٰ و متوسط درجے کے معقول انسان سے بھی ہم توقع نہیں کرسکتے۔ لیکن منکرین کے تصورِ خدا کا یہ حال ہے کہ وہ اس کی ذات پر ایسی ایسی بلاغت کی تہمت باندھتے ملتے ہیں۔

جب قرآن میں اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں واجب التقلید نمونہ رکھ دیا گیا ہے تو ہر ایماندار کی آنکھیں قدرتی طور پر خودبخود آنحضورؐ کی ذات اور اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف طلبِ ہدایت کے لیے اُٹھ جائیں گی۔ وہ قرآن کے ہر حکم اور تقاضے اور مطالبے کے ملنے میں یہ کرید کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اس پر کاربند ہونے کا وہ اسلوبِ حسن کیا ہے اور وہ عملی چال کونسی ہے جسے رسول اللہ نے اختیار فرمایا ہو۔

یہ آیت اس معاملے میں قطعی حکم لگاتی ہے کہ تنہا خدا کی کتاب کو لے کر اور رسالت کے اسوہ کو اس سے منقطع کر کے کوئی شخص نہ دین کے تقاضے پورے کرسکتا ہے اور نہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے مرحلے سے بہ سلامت گزر سکتا ہے۔ ہاں، یہ آیت قطعی حکم لگاتی ہے کہ قرآن کے اصول و احکام عملی جامہ پہننے کے لیے اپنے ساتھ ایک انسانی رسول کے اسوہ کے متقاضی ہیں

---

۴۔ یہ بڑی خوب ترجمانی ہے۔ اس ترجمہ سے یہ مفہوم از خود حاصل ہوجاتا ہے کہ اگر تم خدا کے دین پر کاربند ہونے میں رسولؐ کی چال چھوڑ کر کوئی اور چال چلے تو پھر جو چال بھی چلے، نہایت بُری چلے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لفظ "اُسوہ" دوسرے مقام پر | سورۂ ممتحنہ بغیر کسی تمہید کے ایک قطعی حکم سے شروع ہوتی ہے۔ اہل ایمان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء" (یعنی میرے اور اپنے دشمنوں سے دوستانہ روابط نہ رکھو)۔ اس سلسلۂ بیان میں یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ خدا کے دین اور اسلامی نظامِ ریاست و معاشرت کے دشمنوں کے معاملے میں مسلمان افراد اور مسلم سوسائٹی کو کتنا مضبوط اور بااصول ہونا چاہیے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اٹھا کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین امنوا معہٗ، یعنی تمہارے لیے حضرت ابراہیمؑ میں اور ان لوگوں میں جو آپؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے اسوۂ حسنہ یا صحیح روش کا نمونہ موجود ہے۔ اس نمونہ کو وہاں سے لے کر قرآن مسلمانوں کے سامنے رکھ کر اس کے اختیار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ مثالی روش کیا تھی جسے حضرت ابراہیم اور آپؑ کے ساتھیوں نے اختیار کیا؟ وہ یہ تھی کہ جب ان کی قوم خدا کے دین کی دشمنی پر تُل گئی اور دعوتِ حق کے لیے اس نے اپنے سارے دروازے بند کر لیے تو حق کے ان علمبرداروں نے بغیر لاگ لپیٹ کے یہ کہہ دیا کہ "ہم تم سے بھی کنارہ کش ہوتے ہیں اور اُن (معبودوں) سے بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم نے تم سے انحراف اختیار کیا، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک مستقل دشمنی اور بیر کا آغاز ہو گیا ——— تا آنکہ تم ایمان لاؤ اکیلے اللہ پر!

اس مثالی روش کو پیش کر دینے کے بعد پھر وہی الفاظ آتے ہیں کہ:-

| | |
|---|---|
| لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ | تمہارے لیے اِن (کی زندگیوں) میں بہترین (مثالی) |
| لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ | روش ہے ——— ہاں! اس کے لیے جو اللہ اور یوم |
| (ممتحنہ - ۱) | آخرت کا متوقع ہے۔ |

اور پھر اس کے بعد وعید بھی سنیے:- ومن یتول فان اللہ ھو الغنی الحمید، یعنی جو کوئی اس اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے سے منہ موڑے تو ایسے لوگوں سے اللہ بے نیاز ہے اور وہ اپنی خوبیوں سے آپ ہی ستودہ صفات ہے!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکم دیا جا رہا تھا دشمنان حق سے دوستی نہ رکھنے کا، لیکن ایک پیغمبر اور اس کے صحابیوں کی زندگی سے اسوۂ حسنہ چھانٹ کے سامنے رکھا تو معلوم ہوا کہ دوستی نہ رکھنے کا فعل صرف منفی (NEGATIVE) حد تک ہی مطلوب نہیں، بلکہ مثالی روش یہ ہے کہ جب حق و باطل میں کشمکش شروع ہو جائے تو لگی لپٹی رکھے بغیر مثبت طور پر اپنی باطل دشمنی کو نمایاں کر دیا جائے اور ڈٹ کے ناسازگار حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ اس معاملے میں خاندانی تعلقات، برادریوں کے رشتوں ناطوں، مفاد کی وابستگیوں اور دوستیوں دلچسپیوں سب کو بالکل بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ یہ مثالی روش اگر اوپر کے حکم کی شارح نہ بنے تو وہ حکم ہمیں اس حد سے بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے جس حد تک یہ مثالی روش ہمیں کھینچ لاتی ہے۔ یہیں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء کے اسوۂ حسنہ سے اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کو منقطع کر کے لے لیا جائے تو اس حکم کے عملی تقاضے مختلف لوگ مختلف ذہنوں کے ساتھ کہیں بہت پیچھے ہٹ کر مقرر کر دیں گے اور کہیں بہت آگے بڑھ کر۔ اور اس افراط و تفریط میں وہ بھلی چال اور وہ اعلیٰ اسلوب چھوٹ جائے گا جو انبیاء و رسل ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

پس جس طرح یہاں مطالبہ صرف آیت کتاب کی اطاعت پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اسوۂ ابراہیمی کو اس کے ساتھ رکھ کر زور دیا گیا ہے کہ یہ اطاعت اس ڈھنگ اور اس اسلوب سے کی جانی لازم ہے ورنہ اللہ کو تم سے کوئی واسطہ نہیں ہو گا، اسی طرح پورے کے پورے قرآن کی اطاعت کے لیے چاہا یہ گیا ہے وہ ٹھیک اسی اسلوب اور اسی ڈھنگ اور اسی نہج سے کی جانی چاہیے۔ اور اسی نمونہ و معیار کو سامنے رکھ کر کی جانی چاہیے جسے رسول اللہؐ کی عملی زندگی کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس طرح اس آیت نے حضرت ابراہیم اور آپؑ کے ساتھیوں کی زندگی کے ایک عملی پہلو کو سند اور اتھارٹی کے وزن کے ساتھ ہمارے سامنے رکھا ہے، پورا قرآن ٹھیک اسی طرح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی کو سند اور اتھارٹی کے وزن کے ساتھ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔

**اُسوہ کی ضرورت** اُسوۂ رسالت کی اتنی شدید اہمیت اگر ہمارے سامنے آتی ہے تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین میں اس کی یہ اہمیت کس ضرورت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ اس سوال پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جب ہم غور کرتے ہیں تو وہ ضرورت اتنی مبہم نہیں ہے کہ اس کا انکشاف ہم پر نہ ہو سکے۔ کتاب کے ساتھ اُسوہ کی ضرورت دین میں بوجوہ ذیل پیدا ہوتی ہے:

— دین کی بہت سی اصولی قدریں ایسی ہیں کہ اگر ان کے ساتھ اسوۂ رسول ہمارے سامنے نہ آئے تو وہ تصوراتِ مجردہ ہو کے رہ جائیں جن کو اپنی رسائی اور گرفت سے باہر اور اپنے ظرف سے وسیع تر پاکر ذہن لذتِ مرعوبیت تو حاصل کر سکے لیکن انہیں اپنی عملی زندگی کی حقیقتیں بنانے پر کبھی قادر نہ ہو۔ اب اگر ہماری دینی قدریں تصوراتِ مجردہ بن کے رہ جائیں تو کسی ڈھنگ کا تصوف تو چل سکتا ہے، نظام زندگی استوار نہیں ہوتا۔

— بہت سے دینی تقاضے ایسے ہیں کہ اگر وہ مجرد اصولی حیثیت سے پیش کر دیئے جائیں تو ان کو عمل میں لانے کے لیے طرح طرح کی صورتیں رائج ملتی ہیں اور طرح طرح کی صورتیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔ ان مختلف صورتوں کے جنگل میں اگر آدمی کو بغیر کسی عملی رہنمائی کے چھوڑ دیا جائے تو وہ کبھی ادھر قدم بڑھائے، کبھی اُدھر، اور بالآخر تھک ہار کر سرے سے چلنے ہی سے ہمت ہار بیٹھے۔ اختلافات کے لیے اگر میدان بالکل غیر محدود چھوڑ دیا جائے تو افراد اپنے اپنے رنگ کی مذہبیت لے کے چل سکتے ہیں، ایک دینی سوسائٹی انتشار کے بل پر نہیں بن سکتی۔

— بہت سے احکام وہ ہیں کہ چار چھ لفظوں کے جملوں میں بیان ہو گئے ہیں اور ان کی اصولی حیثیت نے بے شمار تفصیلات کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے، اب اگر ان پر عمل کرنے کا ارادہ کر کے چلیے تو پہلے ہی قدم سے عملی زندگی طرح طرح کے سوالات اٹھا کے سامنے رکھنا شروع کر دیتی ہے، اور پھر کوئی راہی پہلے قدم پر، کوئی دوسرے قدم پر اور کوئی تیسرے قدم پر اپنے عمل کا راستہ غیر متعین پاکر دم توڑ کے رہ جائے گا۔ معاملہ اگر محض انفرادی اخلاق تک محدود ہوتا تو بھی کوئی بات تھی، جب سامنے اجتماعی ہیئت کو برپا کرنے کا قضیہ ہو تو زندگی کے ہر پہلو میں عملی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔

— انسانی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ نظریات، اصول اور احکام کے الفاظ کا مفہوم ہمیشہ ان کو پیش کرنے والی عملی زندگی ہی سے اخذ کرتی ہے، وہ عملی زندگی ہی سے متاثر ہوتی ہے اور عملی زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہی اس کے اندر تحریک پیدا کرتی ہے۔ کسی بے ضرر اور صلح کل دھرم اور مت کا معاملہ ہوتا تو بھی خیر یونہی کام چل جاتا، یہاں ضروریات سامنے ہیں ایک ایسے دین کی جو حق و باطل کی کشمکش کا پیغام بر کے آیا ہے۔

—— نظریات اور احکام دونوں کا جو جز بھی سامنے آتا ہے اسے سوچنے والا ذہن پہلے سے اُسی سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے جو کسی مخالف نظریے اور مجموعۂ رسوم و روایات پر قائم ہونے والے اجتماعی ماحول نے بنا کر صدیوں سے مسلط کر رکھا ہوتا ہے، ہر معاشرے کی کچھ محبوب قدریں ہوتی ہیں جو سالہا سال سے دلوں کے اندر جڑیں پکڑنے کی وجہ سے اپنے لیے غیر شعوری طور پر کافی خراج رواداری لوگوں سے حاصل کر لیتی ہیں، کچھ عادات ہوتی ہیں کہ ان کے قفس میں شعور مدتہائے دراز سے اسیر چلا آتا ہے اور احساس اسیری مٹتے مٹتے اسے یہاں پہنچا دیتا ہے کہ وہ اسی قفس کو نشیمن سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح انسانی ذہن اپنی بہت سی کمزوریوں کی وجہ سے کسی نظریے اور کسی حکم کو اس طرح سوچتا ہے کہ اس کی جدت اور سوسائٹی کی قدامت کے درمیان زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک سمجھوتہ ( [illegible] ) ہو سکے۔ الفاظ اور اصطلاحات کے معانی اور تصورات کی تفصیل ہمیشہ اسی ذہنی ساخت سے عین مطابقت اختیار کرنا چاہتی ہے جو کسی معاشرے نے افراد پر مسلط کر رکھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے بھی یہ ناگزیر ہوتا ہے کہ نبی اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے اسلامی نظریات و احکام کا وہ مفہوم تعین سے سامنے رکھ دے جو خود اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی جس عقیدے کو سامنے لاتا ہے اور جس حکم کو بیان کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ رسوم و روایات اور اندازِ فکر کے پرانے قفس کو توڑ کر عمل کے نئے راستے نمایاں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے نئے پیغام کی نئی اصطلاحات میں پرانے تصورات کو گھر کرنے سے روک دیتا ہے، وہ اپنی دعوتِ حق کو ماننے والوں کے ذہن کو ماحول پر حکمرانی کرنے والے قدیم باطل سے سازباز کرنے سے بچاتا ہے۔

یہ ہیں وہ ضروریات جن کے لیے کتابِ الٰہی کے احکام کے تعین، ان کی تشریح اور ان کی تعبیر کے لیے اُسوۂ نبی کو سند اور معیار کی حیثیت سے سامنے رکھا گیا ہے۔

**نبی کارِ نبوت میں اُسوہ نہیں ہوتا** | نبی اور رسول اپنی اس حیثیت میں سرے سے اُسوہ ہوتا ہی نہیں کہ وہ نبی یا رسول ہے۔ رسالت و نبوت ایک ایسا فریضۂ خاص اور منصب امتیازی ہے جو خود نبی ہی تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



محدود رہنے والا ہوتا ہے اور امت چونکہ اس منصب کی حامل نہیں ٹھہرائی جاتی، لہٰذا خاص اس معاملے میں نبی و رسول کا اسوہ ہونا کہ اس نے وحی کو لوگوں تک کس طرح پہنچایا اور شانِ نبوت کے تقاضے کس انداز سے پورے کیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی ذات میں، اس کے اقوال و اعمال میں، اس کی سیرت و کردار میں، اس کی معاشرت و معیشت میں، اور اس کی سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں میں اگر قابلِ تقلید نمونہ رکھا گیا ہے تو اُن امتیوں کے لیے رکھا ہے جو منصبِ نبوت پر نہیں، بلکہ منصبِ اطاعتِ نبوت پر مامور ہیں۔ لہٰذا لازماً وہ اسوۂ نبوت کے علاوہ دوسرے ہی پہلوؤں میں ہو سکتا ہے۔

یہ تصریح اس لیے ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض رخنہ انگیز ذہن رسول اللہ کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے حیثیتِ رسالت کو تو کوئی نہ کوئی شرعی اہمیت دیتے ہیں، لیکن دوسری تمام حیثیتوں کو جو امارت و بشریت کے عنوان سے سامنے لائی جاتی ہیں، وہ شرعاً ناقابلِ اعتناء قرار دے کر بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ اس رخنہ انگیزی کے معنی یہ ہیں کہ نبی کا اسوہ ہونا خود کارِ نبوت و رسالت کے لیے مخصوص ہو گیا اور امارت و بشریت کے زیرِ عنوان آنے والی عملی سرگرمیوں میں وہ نمونہ کی روش امت کے سامنے پیش کرنے والا نہ رہا! لیکن ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ کارِ نبوت و رسالت میں امت کو نمونہ لینے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ یہ منصب اس کا ہے ہی نہیں۔ اب جب نبی و رسولؐ کا کارِ نبوت و رسالت میں اسوہ ہونا سرے سے مطلوب نہ نکلا، اور دوسرے پہلوؤں سے وہ شرعاً اتھارٹی نہ قرار پایا تو آخر قرآن میں اسے سرے سے اسوہ قرار دینے کی ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے؟ کیا (نعوذ باللہ) یہ کوئی سہو ہے؟

جو حضرات رسولؐ اللہ کی حیثیتِ امارت اور حیثیتِ بشریت کے مختلف شعبوں کو نظامِ شریعت مرتب کرتے وقت اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیتے ہیں وہ اس مطالبے کے لیے کہ رسول اللہ کی زندگی سے بہترین روش کا نمونہ اخذ کرو، قرآن میں کوئی جگہ پیدا نہیں کر سکتے! اور اگر یہ مطالبہ قرآن میں ہے اور بجا طور پر ہے اور اس کی کوئی دینی و شرعی اہمیت ہے تو پھر یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ نبی و رسول کی زندگی — کارِ نبوت کے ایک پہلو کے سوا — ہر لحاظ سے واجب التقلید نمونہ ہے، اور امارت و بشریت ہی کی سرگرمیوں میں نمونہ ہے۔ اس نمونہ کے بغیر نہ رضائے الٰہی کا حصول ممکن ہے، نہ اُخروی نجات کی گنجائش!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



**اُسوۂ رسالت کے مفہوم کی وسعتیں** اب قابلِ غور امر یہ سامنے آتا ہے کہ جملہ انبیا کی طرح رسول اللہ صلعم کی زندگی کا امت کیلیے مثال ہونا کن کن پہلوؤں کو محیط ہے اور اس کی وسعتیں کہاں تک پہنچتی ہیں۔ اس کا سیدھا سا مختصر جواب یہ ہے کہ آنحضورؐ کی پوری کی پوری زندگی اپنے ہر پہلو میں اسوہ و نمونہ ہے۔ تمام اہل ایمان کے لیے! اس وسعت کے کسی گوشے کا استثنیٰ ہمیں کتابِ الٰہی میں نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلعم کی یہ شان اپنے اندر کامل عمومیت رکھتی ہے۔ آنحضور صلعم کی جتنی مختلف اصولی حیثیتیں ہم نے اوپر بیان کی ہیں اُن میں بھی اور وہ تمام متفرق حیثیتیں جو ہم بیان نہیں کر سکے ان میں بھی آپؐ اس مثالی روش کو قائم فرما دینے والے ہیں جس کو اختیار کرنا امت کے لیے قطعی طور پر واجب ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ :۔

—— آنحضورؐ کی زندگی جب معلمِ کتاب و حکمت ہونے کی حیثیت میں سامنے آتی ہے تو وہ ہر اس شخص اور ادارے کے لیے نمونہ قرار پاتی ہے جو تعلیمِ کتاب و حکمت کا کام کسی بھی ملک اور کسی بھی دَور میں کرنے بیٹھے۔ اسے اس تعلیم کا نور پہلے آنحضورؐ سے حاصل کرنا ہو گا اور پھر اسے آگے منعکس کر دینا ہو گا۔ اسے تعلیمِ کتاب و حکمت کے اصول و اسالیب بھی خود آنحضور صلعم کی ذاتِ گرامی سے لینے ہوں گے اور اسے ان حدود و قیود کی پابندی اختیار کرنی ہو گی جو اس منصب کے لیے آپؐ نے عملاً مقرر فرما دیئے ہیں۔

—— اسی طرح آپؐ نے افراد اور معاشرہ کے ذہنی و عملی تزکیہ کا کام کرنے میں بہ حیثیت اللہ کی طرف سے مامور ہونے والے مزکّی کے جو مثال قائم کر دی ہے وہ بعد میں اس کام کے کرنے والے ہر امتی کے لیے یہ امور طے کر دیتی ہے کہ تزکیہ کا مقصود و مدعا کیا ہے، اس کا صحیح اسلوب کیا ہے، اس کے اصول کیا کیا ہیں اور اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے، کیا کھوٹ میل ہیں جن کو صاف کرنا ہے اور وہ افکار، جذبات اور عادات کیا ہیں جنہیں نصب کرنا ہے۔

—— بہ حیثیت داعی —— اور مامور من اللہ داعی —— کے آپؐ نے ان اصول و اسالیب کو اُسوہ بنا کر پیش کر دیا ہے جن کی پابندی میں حق کے ہر داعی کو کام کرنا چاہیے، اور یہ اُسوہ اختیار کرنا امت کے لیے مستقلاً واجب ہے۔

—— بہ حیثیت ایک ہئیتِ تنظیمی کے معمار کے آپؐ کی ذاتِ گرامی یہ رہنمائی بہم پہنچاتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


کہ خدا کے دین کے مقاصد اور مزاج کے لحاظ سے انسانی تنظیم کی ہیئت کو کس مقصد، کس اصول اور کس نقشے پر استوار ہونا چاہیے، اس کی فطری ساخت کیا ہو، اس کا خمیر کن صفات سے اٹھایا جائے، اس کا نظام سمع و طاعت کس نہج سے چلے، اس کی کمان کیسے ہاتھوں میں ہو اور وہ کس طرح اسے اس کے نصب العین کی طرف لے کے چلیں۔

—— تحریکی لیڈر ہونے کے لحاظ سے حضرت محمدؐ کی ذاتِ گرامی سے ہمیں اُن مقاصد کا شعور ملتا ہے جس کے لیے ایک تحریکی عمل ناگزیر تھا، اس تحریکی عمل کا مزاج ہاتھ آتا ہے، مختلف مراحل کے لیے رہنما اصول ملتے ہیں، اور فی الجملہ وہ ذہنی علوّ اور وسعت سامنے آجاتی ہے جو تحریکِ اسلامی کو لے کے چلنے والے لیڈروں کے لیے ہمیشہ کے لیے ضروری ہے۔ آپ چونکہ لیڈر بھی خود ساختہ یا کسی گروہ کے ووٹوں سے بنے ہوئے نہیں تھے بلکہ اس دائرے میں بھی خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے، لہٰذا تحریکی قیادت کے لیے جو آداب و حدود اور اسالیب و قواعد آپؐ نے عملاً بطور سنت و اسوہ ہمارے سامنے چھوڑے ہیں ان کا اہتمام کرنا عین مسلم رہنے کے لیے ہم پر لازم آتا ہے۔

—— اسلامی ریاست کے امیر —— اور مامور من اللہ امیر —— ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے کارِ امارت کو جس خاص اصولی انداز سے سرانجام دیا ہے، جو ذمہ داریاں بہ حیثیت امیر اپنے سر لی ہیں جو حقوق منصبِ امارت کے لیے مقرر کر دیئے ہیں، جماعت اور امارت کے درمیان جو رابطہ قائم فرما دیا ہے، شورائیت کی قدر کو جس درجہ کی اہمیت دے دی ہے، حکم کرنے کے لیے جو اطوار اختیار فرمائے ہیں، تنقید کا جتنا حق سوسائٹی کو اپنے مقابلے میں عطا فرما دیا ہے، اسلام کی جن دستوری قدروں کے احترام کا ایک معیار قائم کر دیا ہے، اور اسٹیٹ کے وظائف کے لیے جو نہج قرار دے دیا ہے، یہ ساری چیزیں بعد کے اُن تمام سلاطین، اُمرا اور حکمرانوں کے لیے واجب الاتباع ہو گئیں جو وقتاً فوقتاً امت میں پیدا ہوتے رہیں گے۔

—— اسی طرح سپہ سالاری کے منصب پر سرفراز ہونے کی حیثیت میں آپؐ نے جنگ و صلح، مالِ غنیمت کے انصرام، مفتوحین کے ساتھ طرزِ عمل، قیدیوں کے ساتھ طرزِ معاملہ وغیرہ کے مسائل میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کے احکام کو جس شکل میں عملی جامہ پہنایا ہے اس سے نمونے کی ایک روش اخذ ہوتی ہے اور وہ روش ہر دور کے مسلم سپہ سالاروں کے لیے ایک معیار اور اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔

——— اسلامی حکومت کے شعبۂ عدلیہ کے تحت جب آپؐ مسندِ قضا پر تشریف فرما ہوتے تھے تو آپؐ ایک عام قاضی کی حیثیت سے بالاتر امت کے تمام قاضیوں اور ججوں کے لیے اُسوہ بھی ہوتے تھے۔ آنحضورؐ نے اسلامی نظامِ عدالت کے لیے مقدمات کا جو طریقِ کار روائی مقرر فرما دیا ہے اس کے لیے جس طرح کی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، فریقین کو مساویانہ مرتبہ پر رکھنے اور ملزم کو جوابدہی کا پورا پورا موقع دینے اور بغیر ثبوتِ جُرم کے کسی پر کوئی سزا نافذ نہ کرنے کے جو اصولی قاعدے عملاً اختیار فرماتے ہیں، قانونِ اسلامی کے مختلف اصولی احکام کی جو تعبیر و تشریح اپنے فیصلوں میں کر دی ہے، عام اصولوں سے جو استثنا پیدا فرما دیئے ہیں حکم خاص کو جہاں عام اور حکم عام کو جہاں خاص کر دیا ہے، یہ سب امور ایسے ہیں کہ امت کے نظامِ عدالت کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پورے وجوب کے ساتھ اُسوہ بن کر آ گئے ہیں۔ آپؐ چونکہ ایک مامور من اللہ جج تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعد کے ججوں کے لیے نمونہ تھے، لہٰذا اب عدالتی امور میں آپؐ کا اسوہ اپنے اندر سند کا وزن رکھتا ہے۔

——— اقامتِ عبادات کے سلسلے میں آنحضورؐ کی ذاتِ گرامی نے نماز کے قیام و اہتمام اور اس کی امامت، جمعہ اور عیدین کی خطابت، زکوٰۃ کی تحصیل اور مستحقین تک اس کی ترسیل، اور اسی طرح حج کی امارت وغیرہ کے فرائض کی انجام دہی کرتے ہوئے جو جو اصولی طور طریقے اختیار فرمائے ہیں وہ اس دائرہ میں بعد والوں کے لیے اُسوہ ہونے کی وجہ ہی سے سند اور حجت ہو گئے ہیں۔

——— پھر معاشرت میں آنحضورؐ نے جو روش اپنی گھریلو زندگی کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں، پھر جس طرح لین دین اور تجارت اور قرض کے معاملات انجام دیتے ہیں مجالس اور عام میل جول کے جو آداب اختیار فرماتے ہیں، یا ان امور میں جو ہدایات اُمّت کو دیتے ہیں وہ اپنے اپنے دائرے میں قطعی حجت ٹھیرتے ہیں۔

رسالت اِن ساری حیثیتوں کی جامع ہے | رسول کی رسالت کو ایک ایسا جداگانہ منصب نہیں قرار دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جا سکتا جو اس کی ان ساری متنوع حیثیتوں سے کٹ کر الگ ہو سکتی ہو۔ وہ جملہ امارتی فرائض کی انجام دہی ہیں بھی اور تمام انسانی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے بھی عام امراء اور عام انسانوں کے مقابلہ میں ایک فوق رتبہ رکھتا ہے، یعنی اس کی رسالت ہر جگہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی رسالت خود اتنا جامع مرتبہ ہے کہ وہ ان جملہ مراتب کو حاوی ہے۔ وہ معلم ہے تو ایسا معلم ہے جو اپنی رسالت کے تقاضے سے معلم بنایا گیا ہے، وہ اگر مزکی ہے تو ایسا مزکی ہے جو خود فرائض نبوت کی ضرورت سے مزکی قرار پایا ہے۔ اسی طرح وہ اگر داعی، ناظمِ جماعت، تحریکی لیڈر، امیرِ ریاست، سپہ سالارِ افواج، قاضیٔ عدالت، امامِ صلوٰۃ، خطیبِ جمعہ، محصّلِ زکوٰۃ اور امیرِ حج ہے تو ان سارے مناصب پر وہ خود نبوت و رسالت ہی کے زیرِ اثر یہ سب کچھ ہے۔ یہ سارے کام اس کے منصبِ نبوت و رسالت کے تحت جمع ہو جاتے ہیں اور ان سارے معاملات میں اس کی پیغمبرانہ حیثیت ہی کمان کرتی ہے۔

رسول کی حیثیتِ نبوت و رسالت کو ان جملہ دوائرِ حیات کی مثالی روش سے کاٹ کر الگ نہیں رکھا جا سکتا کہ لو نبوت و رسالت کا منصب تو الگ ہوا، اب جو کچھ باقی بچا وہ ایک عام امیر اور ایک معمولی انسان کے کاموں کی طرح اپنے اندر کوئی شرعی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ حیثیتِ رسالت کو دوسرے مناصب سے الگ کر دیجیے تو پھر رسول کے اندر امت کے عام لوگوں کے لیے اسوہ کہاں رہ گیا کہ لوگ رسول کی حیاتِ طیبہ پر نگاہِ تجسس ڈال کر اس سے کوئی رہنمائی اخذ کریں اور اس کی سیرت میں کسی مثالی روش کی جستجو کریں۔

**حیثیتِ امارت کے تصورِ علیحدگی کا مغالطہ** رسالت سے کچھ لوگ ان تمام سرگرمیوں کو منقطع کر کے الگ رکھ دیتے ہیں جو امارت کے فرائض میں داخل ہوتی ہیں۔ اُس پر دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چونکہ ایک امیر اپنے وقت کے حالات کے تحت بے شمار اقدامات روزمرہ امور میں ایسے کرتا ہے جو انہی حالات میں قابلِ عمل یا واجب العمل ہو سکتے ہیں، لہٰذا حیثیتِ امارت سے متعلقہ فرائض — قیادت، حکمرانی، قضا، سپہ سالاری — وغیرہ امور میں رسول جو جو کچھ امور انجام دیتا ہے ان کی قدر و قیمت وقتی ہوتی ہے اور جس طرح کسی بھی دوسرے امیر کے اقوال و افعال کی قدر و قیمت ان کا وقت گزرنے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رسولؐ کے اماراتی اقدامات کی قدر و قیمت بھی ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔ ان میں کوئی مستقل شرعی وزن نہیں ہوتا۔ ان میں حجیت اور سند ہونے کی شان نہیں پائی جاتی۔

لیکن اس میں اصل مغالطہ یہ ہے کہ روزمرہ وقتی اقدامات کے اندر سے وہ اصول بھی ماخوذ ہوتے ہیں جو خود کارِ امارت اور اس کے گوناگوں ذیلی شعبوں کی ذمہ داریوں کی سرانجام دہی میں برتتے جانے والے ہوتے ہیں اور جن کی قدر و قیمت مستقل ہوتی ہے۔ یہی چیزیں ہیں جن کو اسوہ کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ رسول اپنے کارِ امارت میں اگر کوئی اُسوہ نہیں رکھتا تو اور اس کے اندر اُسوہ ہے کس پہلو سے؟ عام امرا اور رسول میں فرق یہی ہے کہ وہ اسوہ نہیں ہوتے اور رسول ان امور میں اُسوہ چھوڑ کے جاتا ہے۔ رسالت وامارت کی تفریق کے معاملے میں ایک دوسرے پہلو سے ہم آگے چل کے بحث کریں گے۔

رسول اللہ بحیثیت انسان بھی اُسوہ ہیں | امارت کی طرح آنحضورؐ صلعم کی زندگی کے ایک اور گوشے کو بشریت کا نام دے کر رسالت کی شان سے الگ کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اس کے لیے بالعموم ایسے چند واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے جن میں آنحضورؐ صلعم نے کوئی ایک رائے ظاہر کی اور بعد میں آپ نے اس سے رجوع کر لیا، کوئی مشورہ دیا اور اس کا قبول کرنا واجب نہیں ٹھہرایا، کسی خیال کا اظہار کیا اور بعد میں اسے واپس لے لیا۔ انہی واقعات میں کھجوروں کے درختوں کو گابھا لانے کا واقعہ بھی شامل ہے۔

لیکن اگر لوگ ان معاملات میں ذرہ بھر بھی تامل و تفکر سے کام لیتے تو ان کو خود اندازہ ہو جاتا کہ دین نے زندگی میں ایک وسیع دائرۂ اباحت بھی چھوڑا ہے۔ اس دائرے میں بے شمار امورِ عادی آتے ہیں، مثلاً ایک خاص موسم، ایک خاص دورِ تمدن، ایک خاص جغرافی وطبعی ماحول، ایک خاص معیارِ ذوق کے تحت کھانے پینے، لباس اور وضع قطع، بستر اور فرنیچر، مکان اور اسبابِ ضروریہ کا کوئی خاص طرز جس طرح ہر آدمی اختیار کرتا ہے، نبی بھی اختیار کرتا ہے۔ ان امور میں جہاں تک کسی خاص اخلاقی اصول یا کسی خاص ادب کے اختیار کرنے کا پہلو ہوتا ہے، نبی اُسوہ قرار پاتا ہے، لیکن اصول و ادب کی حد سے آگے جب پسند و ناپسند کا ذوقی و عادی میدان شروع ہو جاتا ہے تو یہ پورا میدان اباحت کا میدان قرار پاتا ہے۔ اسی طرح طبعی علوم اور حرفی فنون کے میدان میں انسان کے لیے شریعت نے بڑی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



چھوٹ رکھ دی ہے اور کسی رائے کے اختیار کرنے اور کسی کے ترک کرنے کی عام آزادی دے دی ہے۔ نبی و رسول جہاں واجبات و محرمات کے بارے میں عملی مظاہرہ (demonstration) کر کے امت پر حدود عمل نمایاں کر جاتا ہے، اباحت کے میدان کی وسعتوں کو بھی وہ بہ حیثیت نبی و رسول ہی —— نہ کہ بہ حیثیت عام انسان کے —— مکمل طریق سے واضح کر دیتا ہے۔ اُس کا کسی مشورہ کا دینا اور پھر اس کے معاملے میں ماننے نہ ماننے کا اختیار مخاطب کو دے دینا، اس کا ایک رائے ظاہر کرنا، پھر اسے واپس لے لینا اور اس کا ایک خیال سامنے لانا اور پھر اس سے رجوع کر لینا اس حیثیت سے اُسوہ ہے کہ اسی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کن معاملات میں ایک رائے رکھنا یا دوسری رائے اختیار کرنا، ایک سمت قدم اٹھانا یا دوسری سمت حرکت کرنا شرعاً بالکل مساوی ہیں، اور ان امور میں نہ ایک صورت کا اختیار کرنا واجب، نہ دوسری کا اختیار کرنا گناہ۔ اور رائے صحیح ہو تو شرعاً اس پر وعدۂ انعام نہیں، اور رائے غلط ہو تو دینی ضابطے کی رو سے اس پر وعیدِ سزا نہیں۔ اباحت کے دائرے میں معیارِ فیصلہ خود افادیت ہے —— اور افادیت کا معیار طبعی اور فنی آگہی سے ملتا ہے، نہ یہ کہ کتابِ الٰہی تمام علومِ طبعی اور فنونِ حرفی کی گائڈ بن کے اترے، یا نبی و رسول اباحت کے ان دائروں میں امت کے لیے واجب التقلید رہنما قرار پائے۔

پس رسول کی حیثیتِ بشریت کو الگ کر کے جو مثالیں اس کے تحت سامنے لائی جاتی ہیں، ان میں بھی درحقیقت رسول ایک اُسوہ پیش کرتا ہے، اور اس اُسوہ سے دائرہ اباحت کی حدود ہمارے سامنے واضح ہوتی ہیں۔

**ہمہ تن اُسوہ** | اب تک کی بحث سے جو حقیقت ہم واضح کرنا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ :۔

۱۔ رسولؐ کی زندگی میں امت کے لیے واجب التقلید نمونے کی روش رکھی گئی ہے۔

۲۔ کارِ نبوت میں امت کے لیے اُسوہ نہیں ہوتا، بلکہ انہی پہلوؤں میں اُسوہ ہوتا ہے جن میں اُمت کو آگے چل کے کام کرنا ہے

۳۔ امارت و بشریت ہی کے دائروں میں رسولؐ اسوہ ہوتا ہے اور اس کی زندگی کا ہر ہر شعبہ امت کے لیے معیار اور نمونہ پیش کرتا ہے

دوسرے لفظوں میں رسول ہمہ تن اُسوہ ہوتا ہے اور بجز ایک کارِ نبوت کے اور کسی شعبے کو اس کی زندگی سے کاٹ کر الگ رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں وہ اُسوہ نہیں رہا؛ پس جہاں جہاں تک وہ اُسوہ ہوگا، سندِ اطاعت بھی اور حجت بھی ہوگا!

© rasailojaraid.com